گوئٹے کا دیوان غربی اور پیام مشرق
ایک مطالعہ

ڈاکٹر اسلم انصاری

علامہ اقبال کے فکر وفن سے دلچسپی رکھنے والے ارباب فکر ونظر سے یہ امر مخفی نہیں ہوسکتا کہ حضرت علامہ جرمن زبان کے عظیم شاعر اور مفکر گوئٹے کے کس حد تک معترف تھے۔ گوئٹے کا نام ان کی شاعری میں پہلی بار اس وقت آیا جب انہوں نے ''مرزا غالب'' کے عنوان سے نظم لکھی جو ۱۹۰۱ء میں مخزن میں شائع ہوئی۔ اس نظم میں انہوں نے گوئٹے کو مرزا غالب کا ہمنوا قرار دیتے ہوئے لکھا:

آہ ! تو اجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہے
گلشن ویمر میں تیرا ہمنوا خوابیدہ ہے

یہ نظم اس ذیلی نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی۔ ''ملک جرمنی میں ایک مقام ہے جہاں گوئٹے شاعر مدفون ہے۔''[۱] اس سے قبل اردو شعر وادب میں گوئٹے کا نام کہیں لیا گیا یا نہیں، اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اتنی بات یقینی ہے کہ اردو شاعری اور برصغیر کی ذہنی زندگی میں گوئٹے کی نمود اقبال کی دین ہے جنہوں نے متذکرہ بالا نظم کے ذریعے مخزن کے قارئین کو اس سے متعارف کرایا۔

مغرب میں گوئٹے اپنے طویل منظوم ڈرامے فاؤسٹ کی وجہ سے عالمگیر شہرت کا حامل ہے، فاؤسٹ لکھنے سے پہلے اس نے ایک ناول لکھا تھا جس کا عنوان تھا: نوجوان ورتھر کے آلام یہ ایک المیہ کہانی تھی اور کہا جاتا ہے کہ یہ بہت حد تک گوئٹے کے سوانحی حالات پر مشتمل تھی۔ اس نظم کی اشاعت نے گوئٹے کو دنیائے ادب میں متعارف کرایا بلکہ اسے ایک درجۂ اول کا ادیب بھی تسلیم کرلیا گیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس ناول کے تراجم پڑھ کر سارا یورپ آنسوؤں میں ڈوب گیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ بعد کے سالوں جب وہ پختگی کی عمر کو پہنچا تو اس ناول کا مصنف ہونا اس کے لیے چنداں فخر کا باعث نہ رہا۔ اس کے باوجود اس کے پرانے مداح ہمیشہ اسی ناول کے مصنف کی حیثیت سے اس کی زیارت کرنے آتے تھے۔

یوں تو گوئٹے کو مشرقی ادبیات سے شروع ہی سے دلچسپی تھی، اور اس نے تخیل کی سطح پر مشرقی ممالک کے سفر بھی کیے تھے جن کی تفصیل بھی اس نے اپنی متعدد کتابوں میں لکھی لیکن یہ حافظ شیرازیؒ کے دیوان کا مکمل ترجمہ تھا جس نے اس کے تخیل کو بشدت مہمیز کیا۔ وہ دیوان حافظ سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے خود ایک مشرقی دیوان مرتب کرنے کا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ اس نے ۱۸۱۹ء میں *West-Eastern Diwan* کے نام سے یہ دیوان شائع کیا جس نے اس وقت کے جرمنی کی ادبی دنیا میں ہلچل مچا دی۔ مشرق پسندی کی جس تحریک کا آغاز گوئٹے کے پیش رو ہرڈر نے کیا تھا، گوئٹے کے دیوانِ غربی نے اس کو نئی زندگی عطا کر دی۔ اور مشرق پسندی نے جرمنی میں ایک بہت بڑی ادبی تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ اس ادبی تحریک کی کچھ تفصیل علامہ اقبال نے دیوان غربی کے جواب میں لکھی گئی اپنی معرکہ آرا شعری تصنیف پیام مشرق کے دیباچے میں بیان کی ہے۔ دیوان غربی کے انگریز مترجم ایڈورڈ ڈاؤڈن کی اہلیہ نے اس ترجمے کے دیباچے میں ایک مختلف صورت حال کی نشان دہی بھی کی ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

> گوئٹے کی متغزلانہ شاعری کے آخری مجموعے *West-Eastern Diwan* سے بہت کم انگریز قارئین واقف ہیں۔ بہت سے لوگوں نے جو فاؤسٹ اور افی جینی سے مانوس ہیں، شاید ہی کبھی اس دیوان کو کھول کر دیکھا ہو۔ خود جرمنی میں بھی مجموعی طور پر یہ مجموعۂ شاعری اپنے استحقاق سے کم جانا جاتا ہے۔ گوئٹے نے یہ کتاب ۶۵ برس کی عمر میں تصنیف کی۔ اس کے اسلوب اور ذخیرۂ الفاظ میں، نیز افکار و اسلوب میں کہولت کے نشان واضح ہیں۔[۲]

انگریزی ترجمے کی اشاعت کو سو سال سے اوپر گزر چکے ہیں۔ اصل کتاب ۱۸۱۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ علامہ اقبال چونکہ جرمن زبان سے خاصی واقفیت حاصل کر چکے تھے، اس لیے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے یہ کتاب جرمن زبان میں ہی پڑھی ہوگی یہ بات بھی خارج از امکان نہیں کہ ۱۹۱۳ء میں شائع ہونے والا دیوانِ مغربی کا انگریزی ترجمہ بھی ان کی نظر سے گزرا ہو۔ پیام مشرق کے دیباچے کی مجموعی فضا سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشرق کی سربلندی کے احساس سے ان پر انبساطِ خاطر کی کیفیت طاری ہوئی ہوگی۔ یہ دیکھ کر کہ ان کی ایک پہلے سے پسندیدہ مغربی شخصیت نے فارسی شعرا کے تتبع میں پورا ایک دیوان لکھ دیا، انہیں یقیناً اپنے مشرقی ہونے پر فخر و مسرت کا احساس ہوا ہوگا۔ اسی لیے انہوں نے بالآخر اس کا جواب لکھنے کا فیصلہ کر لیا ہوگا۔ پیامِ مشرق کے عنوان سے اس عظیم شعری تصنیف کو مکمل کرنے میں انہیں کم و بیش چار سال کا عرصہ ضرور لگا ہوگا۔ بقول ڈاکٹر جاوید اقبال مئی ۱۹۲۳ء میں پیامِ مشرق کی اشاعت سے چند برس قبل پیامِ مشرق کی تالیف کے متعلق اقبال نے سید سلیمان ندوی کو تحریر کیا:

> فی الحال میں ایک مغربی شاعر کے دیوان کا جواب لکھ رہا ہوں، جس کا تقریباً نصف حصہ لکھا جا چکا ہے۔[۳]

جنوری ۱۹۲۳ء میں اقبال کو سر کا خطاب عطا ہونے کے بعد ان کے اعزاز میں اس وقت کے گورنر پنجاب

کی طرف سے مقبرۂ جہانگیر میں گارڈن پارٹی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مولانا عبدالمجید سالک اس پارٹی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اس پارٹی کے اختتام پر اقبال نے انگریزی میں تقریر کی جس میں انہوں نے یہ انکشاف بھی کیا کہ وہ گوئٹے کے دیوانِ مغرب کے جواب میں ایک کتاب لکھ رہے ہیں، جس کا نام پیامِ مشرق ہوگا۔[۴]

پیامِ مشرق کے دیباچے میں علامہ اقبال نے گوئٹے کے دیوان کو اس کی بہترین تصانیف میں شمار کیا ہے۔[۵] دیوان کے انگریزی ترجمے کی دیباچہ نگار نے جو کسی طرح بھی اقبال کی تنقیدی بصیرت کا مقابلہ نہیں کرتی، دیوان کے بارے میں اس رائے کا اظہار کیا ہے:

> دیوان کی بہت کم نظمیں انفرادی طور پر گوئٹے کی پہلے کی متغزلانہ منظومات کے برابر ہوں گی۔ اس کے باوجود ان نظموں کے مداحین موجود ہیں۔ ہیگل نے ان کو جدید (مغربی) شاعری کا ہراول دستہ قرار دیا۔ ہائنے نے اس سے متغزلانہ شاعری کے آداب سیکھے۔[۶]

علامہ اقبال ہر دور میں گوئٹے کی عظمت کے معترف رہے۔ ۱۹۲۰ء کے آس پاس کے زمانے میں جب وہ پیامِ مشرق لکھ رہے تھے، انہوں نے ایک بار پھر گلشن ویمر کو اپنا سلام بھیجا:

صبا بہ گلشن ویمر سلام ما برسان
کہ چشم نکتہ وران خاک آن دیار افروخت

اس شعر پر اردو میں یہ ذیلی نوٹ دیا گیا ہے: ''جرمنی میں ایک شہر ہے جہاں گوئٹے نے زندگی کا بہت سا حصہ بسر کیا اور بعد از انتقال وہیں دفن ہوا''۔[۷] پیامِ مشرق کے بعد علامہ اقبال کے ہاں گوئٹے کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے۔

گوئٹے والف گانگ فان گوئٹے ۱۷۴۹ء میں پیدا ہوا۔ گویا ۱۹۴۹ء میں اس کی پیدائش کو دو سو سال ہو چکے تھے، چنانچہ اس کا دو سو سالہ سال تولد دنیا کے بیشتر ملکوں میں منایا گیا۔ نوزائیدہ مملکت پاکستان بھی اس سلسلے میں پیچھے نہیں رہی ہوگی، لیکن تفصیلات دستیاب نہیں۔ ایران جس کے اسکالرز کو اس کے مغربی دیوان سے بہت حد تک دلچسپی تھی (انقلاب اسلامی سے قبل کے ایران میں ٹیگور ایک مقبول شخصیت کے طور پر متعارف تھا اس وقت تک اقبال کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی تھی)۔ چنانچہ ایران اور دنیا بھر کے فارسی دانوں کی دیرینہ خواہش کو پورا کرتے ہوئے ایران کے ایک فاضل اسکالر اور مترجم شجاع الدین ضیاء نے دیوان کے پورے متن کے فارسی ترجمے کو نہایت فاضلانہ اور محققانہ مقدمے اور حواشی کے ساتھ شائع کیا، صرف اس ذاتی اجتہاد کے ساتھ کہ مغربی دیوان کو انہوں نے دیوانِ شرقی کا نام دیا اور مقدمے کے علاوہ ترجمے میں ہر جگہ اسے دیوانِ شرقی ہی قرار دیا گیا۔ جیسا کہ سطور بالا میں ظاہر کیا جا چکا ہے کہ دیوان کا اصل نام *West-Eastern Diwan* ہے جس

سے مراد ہے ایسا مشرقی دیوان جو مغرب میں لکھا گیا۔ بہرحال گلاب کا کوئی بھی نام ہو اس کی مہک کو کون روک سکتا ہے اور اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ علامہ اقبال نے اسے ہر جگہ مغربی دیوان ہی کے نام سے یاد کیا ہے۔ خیال رہے کہ ایڈورڈ ڈاؤڈن کا ترجمہ منظوم ہے جبکہ شجاع الدین ضیاء کا ترجمہ اعلیٰ پائے کی فارسی نثر میں ہے۔ اردو اور فارسی کے لسانی اشتراکات کی بدولت ہمارے لیے یہ ترجمہ زیادہ قابل فہم اور پرکشش ہے۔ چنانچہ راقم نے دیوان کی چند نظموں کا ترجمہ انہیں فارسی تراجم کو سامنے رکھ کر کیا ہے البتہ ڈاؤڈن کے منظوم انگریزی ترجمے کو بھی مسلسل سامنے رکھا گیا ہے۔ تمام قرائن سے یہ حقیقت واضح ہے کہ شجاع الدین ضیاؔء نے یہ ترجمہ براہ راست جرمن زبان سے کیا ہے۔

گوئٹے کی ابتدائی ذہنی تشکیل میں اس کے پیش رو ہرڈر (Herder) کا کردار بہت اہم تھا۔ علامہ اقبال نے پیام مشرق کے دیباچے میں اسے جرمن لٹریچر کی مشہور اور قابل احترام شخصیت قرار دیا ہے۔ اور اس کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ ''ہم حافظؔ کے رنگ میں بہت نغمہ سرائی کر چکے، اس وقت سعدیؔ کے تلمذ کی ضرورت ہے۔''[۸] ہرڈرؔ کی اس بات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جرمن ادب میں مشرق پسندی کے ساتھ ساتھ حافظؔ کی تقلید کی روش بھی موجود تھی۔ لیکن گوئٹے کی مشرق پسندی نے ایک طرح سے اس تحریک کو نئی زندگی عطا کر دی۔ اور اسے ایک مصدقہ (Authentic) ادبی تجربہ بنا دیا۔ گوئٹے نے دیوان مغربی ۶۵ برس کی عمر میں مکمل کیا۔ لیکن اس کام کی طرف وہ اس وقت تک متوجہ نہ ہوا جب تک اس کے سامنے دیوان حافظ کا مکمل جرمن ترجمہ نہ آ گیا۔ یہ ترجمہ ہیمرؔ نے ۱۸۱۲ء میں کیا تھا جبکہ گوئٹے کی دسترس میں یہ ۱۸۱۴ء میں آیا۔ یہی وہ ترجمہ تھا جس کے ذریعے گوئٹے حافظ شیرازی علیہ الرحمہ کے طرز فکر اور طرز احساس سے بہت حد تک آشنا ہوا۔ نیطشےؔ نے بھی اس ترجمے کے ذریعے حافظؔ کی شاعری سے شناسائی حاصل کی، بلکہ یورپ کے بہت سے ادیبوں، شاعروں اور نقادوں نے اسی ترجمے سے استفادہ کیا۔ تاہم گوئٹے پر اس ترجمے کا اثر بہت زیادہ ہوا۔ اس کے مطالعے سے اس کے دل و دماغ پر درجہ بدرجہ جو کیفیات طاری ہوئیں ان کی کچھ تفصیل اس نے اپنی یادداشتوں (Memoirs) میں کئی جگہ درج کی ہے۔ جون ۱۸۱۴ء میں حافظؔ کا نام پہلی بار ان یادداشتوں میں درج کرتے ہوئے اس نے لکھا:

> (اس دیوان کے مطالعے سے) میں اچانک آسمان مشرق کی خوشبو اور ابدیت کی نسیم روح پرور سے آشنا ہوا، جو ایران کے دشت و بیابان میں چلتی ہے، اور میں ایک غیر معمولی (خارق العادہ) انسان سے دوچار ہوا جس کی انوکھی شخصیت نے مجھے دیوانہ بنا دیا ہے۔[۹]

گوئٹے پر دیوان حافظ کے اثرات کے حوالے سے شجاع الدین ضیاؔء لکھتے ہیں:

> گوئٹے کے لیے حافظؔ ایک جہان تازہ، ایک روحِ تازہ اور نئی قسم کے شوق و حال کا تحفہ لائے۔ اور اسے مشرق

کی حقیقی روح اور ایران کے فلسفہ وحکمت اور ذوق سے آشنا کیا۔ اور اس جرمن نژاد شاعر کے پیمانے میں وہ شراب انڈیلی جو نیطشے کے الفاظ میں ''دنیا بھر کے خردمندوں کو سرمست کرنے والی تھی''۔[۱۰]

اس غیر معمولی بہجت وانبساط کی کچھ تفصیل علامہ اقبال کی خوبصورت نثر میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

۱۸۱۴ء میں فان ہیمر نے خواجہ حافظ کے دیوان کا پورا ترجمہ شائع کیا اور اسی ترجمے کی اشاعت سے جرمن ادبیات میں مشرقی تحریک کا آغاز ہوا۔ گوئٹے کی عمر اس وقت ۶۵ سال کی تھی۔ اور یہ وہ زمانہ تھا جب جرمن قوم کا انحطاط ہر پہلو سے انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ ملک کی سیاسی تحریکوں میں حصہ لینے کے لیے گوئٹے کی فطرت موزوں نہ تھی۔ اور یورپ کی عام ہنگامہ آرائیوں سے بیزار ہو کر اس کی بیتاب اور بلند پرواز روح نے مشرقی فضا کے اس سکون میں اپنے لیے ایک نشیمن تلاش کر لیا۔ حافظ کے ترنم نے اس کے تخیلات میں ایک ہیجان عظیم برپا کر دیا جس نے آخر کار مغربی دیوان کی ایک پائیدار اور مستقل صورت اختیار کر لی۔ مگر فان ہیمر کا ترجمہ گوئٹے کے لیے محض ایک محرک ہی نہ تھا بلکہ اس کے عجیب وغریب تخیلات کا ماخذ بھی تھا۔ بعض بعض جگہ اس کی نظم خواجہ حافظ کے اشعار کا آزاد ترجمہ معلوم ہوتی ہے۔ اور بعض جگہ اس کی قوت تخیل کسی خاص مصرع کے اثر سے ایک نئی شاہراہ پر پڑ کر زندگی کے نہایت دقیق اور گہرے مسائل پر روشنی ڈالتی ہے۔[۱۱]

اس میں شک نہیں کی دیوان حافظ کا ترجمہ گوئٹے کے لیے جذبے اور تخیل کی ایک نئی دنیا لے کر آیا تھا۔ وہ اس دنیا میں اپنے آپ کو ضم کرنے میں اس طرح مشغول ہوا کہ کچھ عرصے کے لیے باقی سب کچھ بھول گیا۔ علامہ اقبال نے اپنے دیباچے میں گوئٹے کے مشہور سوانح نگار بیل سوشکی کا حوالہ دیا ہے، جو لکھتا ہے:

بلبلِ شیراز کی نغمہ پردازیوں میں گوئٹے کو اپنی ہی تصویر نظر آتی تھی۔ اس کو کبھی کبھی یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ شاید میری روح ہی حافظ کے پیکر میں رہ کر مشرق کی سرزمین میں زندگی بسر کر چکی ہے۔ وہی زمینی مسرت، وہی آسمانی محبت، وہی سادگی، وہی عمق، وہی جوش وحرارت، وہی وسعت مشرب، وہی کشادہ دلی اور وہی قیود ورسوم سے آزادی۔ غرض کہ ہر بات میں ہم اسے حافظ کا مثیل پاتے ہیں۔ جس طرح حافظ لسان الغیب اور ترجمان اسرار ہے، اسی طرح گوئٹے بھی ہے۔ اور جس طرح حافظ کے بظاہر سادہ الفاظ میں ایک جہان معنی آباد ہے اسی طرح گوئٹے کے سادہ پن میں حقائق واسرار جلوہ افروز ہیں۔ دونوں نے امیر وغریب سے خراج تحسین وصول کیا۔ دونوں نے اپنے اپنے وقت کے عظیم الشان فاتحوں کو اپنی شخصیت سے متاثر کیا۔ (یعنی حافظ نے تیمور کو اور گوئٹے نے نپولین کو) اور دونوں عام تباہی اور بربادی کے زمانے میں طبیعت کے اندرونی اطمینان اور سکون کو محفوظ رکھ کر اپنی قدیم ترنم ریزی جاری رکھنے میں کامیاب رہے۔[۱۲]

مغربی دیوان کے اجزائے ترکیبی

چونکہ فارسی میں نامہ اور نامک کے معنی کتاب کے ہیں، اس لیے گوئٹے نے اپنے دیوان کو بارہ کتابوں میں تقسیم کیا۔ انہیں ہم اس کے دیوان کے ابواب بھی تصور کر سکتے ہیں۔ ان بارہ کتابوں کے نام ہیں: مغنی نامہ، حافظ

نامہ، عشق نامہ، تفکیر نامہ، رنج نامہ، حکمت نامہ، تیمور نامہ، زلیخا نامہ، ساقی نامہ، مثل نامہ، پارسی نامہ، خلد نامہ۔

ذیل میں ہم مغنّی نامہ کی اولیں نظم کا ترجمہ پیش کرتے ہیں، یہ ترجمہ شجاع الدین ضیاء کے فارسی ترجمے کو سامنے رکھ کر کیا گیا ہے، البتہ ڈاوؤڈن کے انگریزی ترجمے کے ساتھ اس کا مقائسہ بھی کر لیا گیا ہے، پہلی نظم کا عنوان ہے ''ہجرت''۔ اس عنوان سے بھی اسلامی تاریخ سے گوئٹے کا جذباتی تعلق نمایاں ہے:

ہجرت

شمال ومشرق وجنوب پریشان اورآشفتہ ہیں، (بادشاہوں کے تاج) ٹوٹ پھوٹ رہے ہیں۔ اور عظیم بادشاہتیں اپنے آپ میں لرزہ براندام ہیں۔(اے مغنی) آ۔ اس دوزخ سے نکل بھاگیں، اور دلپذیر مشرق (کی طرف) جانے کا ارادہ کرلیں، تاکہ وہاں روحانیت کی ہوائے نرم تجھ پر چلے اور بزم عشق وشراب ونغمات میں آبِ خضر (آبِ حیات) تجھے جوان کردے۔

آ۔ میں بھی دیارِ مشرق کی طرف جارہاہوں، تاکہ میں وہاں کے گلہ بانوں سے ملوں، اور مشک اور ابریشم کے قافلوں کے ساتھ سفر کروں۔ اور آبادیوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں راستے کی تھکن اتاروں۔ اور پھر صحراؤں اور ویرانوں میں ان راستوں کو تلاش کروں جو شہروں کی طرف جاتے ہیں۔

اے حافظ! دور دراز کے اس سفر میں جو نا قابل عبور نشیب وفراز سے پُر ہے، ہر جگہ تیرے آسمانی نغمے ہمارے رفیق راہ ہیں۔ اور ہمارے دل کو تسلی دیتے ہیں۔ (کیا اس سفر میں) ہمارا رہنما ہر شام کو تیری شورانگیز غزلوں کے اشعار اپنی دلکش آواز میں نہیں گاتا تھا۔ تاکہ آسمان کے ستاروں کو جگائے اور صحرا کے رہزنوں کو ڈراتا رہے......؟

اے مقدس حافظ! میری خواہش ہے کہ ہر جگہ۔ خواہ وہ میخانہ ہو یا گرمابہ [حمّام]، میں تیرے ساتھ رہوں۔ اور اس وقت جبکہ محبوب اپنے رخ سے نقاب ہٹائے اور اپنے پُرشکن گیسوؤں کی خوشبو سے ہمارے مشام جاں کو مہکا دے۔ میں صرف تجھے ہی سوچوں (دیکھوں) تاکہ اس کے جمال دلفریب کی ستائش کرنے کے لیے تیرے اشعار سے استفادہ کرتے ہوئے (تحسین جمال کے نتیجے میں) حوروں کو رشک میں مبتلا کردوں۔

شاعر کی اس سعادت پر حسد نہ کیجیے۔ اور اس کے درپئے آزار نہ ہوئیے۔ اس لیے کہ شاعر کا سخن ایک سبک روح پرندے کی طرح بہشت کے گرد پرواز کرتا ہے اور اس کے لیے حیاتِ جاوداں طلب کرتا ہے۔

''حافظ نامہ'' سے ایک نظم ملاحظہ ہو:

بے پایاں

اے حافظ! تیرا شعر ابدیت کی طرح عظیم ہے، اس لیے کہ (ابدیت کی طرح) اس کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ انتہا ہے۔ تیرا شعر آسمان کے گنبد کی طرح بخود گرفتہ (اور بخود گزیدہ) ہے۔ تیری غزل میں مطلع اور مقطع میں فرق

نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ وہ تمام کی تمام جمال و کمال کی حد کو پہنچی ہوئی ہوتی ہے۔

تو شاعری اور نشاط کا وہ سر چشمہ ہے کہ اس میں سے ہر موج کے پیچھے ایک اور موج اُمڈی چلی آتی ہے۔ تیرا دہن ہمیشہ بوسہ لینے کے لیے، تیری طبیعت نغمہ سرائی کے لیے۔ اور تیرا گلو میخواری کے لیے۔ اور تیرا دل محبت کرنے کے لیے آمادہ رہتا ہے۔

اگر دنیا ختم ہونے لگے، ـ تو میری آرزو ہوگی اے حافظ آسمانی! کہ میں صرف اور صرف تیرے ساتھ، تیرے پہلو میں رہوں۔ اور تیرے توام بھائی کی طرح ہر رنج و راحت میں تیرا شریک رہوں۔ تیرے ساتھ مل کر شراب نوشی کروں، تیری طرح محو تعشق رہوں۔ اس لیے کہ یہ (سب کچھ) میرے لیے افتخار زندگی اور سرمایۂ حیات ہوگا۔

اے میری طبع سخن گو! اب جبکہ تو نے حافظِ ملکوتی سے فیضِ الہام حاصل کر لیا ہے، اپنی قوتِ (سخن گوئی) کے ساتھ نغمہ سرائی کر۔ اور ایسا نغمہ سامنے لا جو ابھی تک نہ گایا گیا ہو۔ اس لیے کہ آج تو پہلے سے کہیں زیادہ سن رسیدہ اور پہلے سے کہیں زیادہ جوان ہے!

ضمناً عرض ہے کہ اب سے بہت برس پہلے راقم نے گوئٹے کی اس نظم کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا جو اسی عنوان کے ساتھ ۸۰ یا ۹۰ کی دہائی میں مجلّہ فنون کے کسی شمارے میں شائع ہوا تھا۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے یہ ترجمہ درج ذیل ہے:

بے پایاں

حافظ! ترا سخن ہے ابد کی طرح عظیم
تیرا کلام گنبدِ افلاک کی طرح
تنہا، بخود گرفتہ و بے مثل و بے کراں
ہر شعر تیرا آیۂ حسن و کمال ہے
ہر ابتدا میں حسن ہے، ہر انتہا میں حسن
ہر مطلعِ غزل ہے طلوعِ حیاتِ نو
ہر مقطع ہے اک اور تغزل کا پیش رو!

تو شعر و انبساط کا وہ چشمۂ جمیل
امواج پے بہ پے کی تراوش سے جو رہے
نغمہ طراز و زمزمہ پرداز و موج زن

تو ذوقِ حسن و نغمہ و صہبا ہے سر بسر
دل تیرا مہرِ مہر رخاں سے ہے زندہ تر!

اے حافظ! اے جہان لطافت کے راز دار
بہرِ بہار ارضِ سخن آسماں ہے تو
دنیا کے شاعروں پہ سدا حکمراں ہے تو
خواہش یہ ہے کہ ختم ہو جب دورِ آسماں
میں تیرا ہم جلیس رہوں، تیرا ہم زباں
جس طرح دو برادرِ توام ہوں ساتھ ساتھ
پہلو میں تیرے بیٹھ کے ساغر بدست میں
جی بھر کے آبِ زندگی افروز پی سکوں

خواہش یہ ہے کہ میں بھی اسی طرح جی سکوں
جیسے کہ تیری وضع حیات و نشاط تھی
یہ خواہشِ رفاقت و رندی و مے کشی
سرمایۂ نشاط ہے میرے لیے یہی
اک آیۂ نشاط ہے میرے لیے یہی! (شب عشق کا ستارہ)

''حافظ نامہ'' کی آخری نظم کو فنی اعتبار سے بہت سراہا گیا ہے، اس کا ترجمہ بھی درج ذیل ہے:

حافظ! (کسی کا) اپنے آپ کو تیرے برابر سمجھنا دیوانگی کی علامت کے سوا کچھ نہیں۔ تو وہ کشتی ہے جو غرور کے ساتھ اپنے بادبانوں میں ہوا بھر کے سمندروں کے سینے کو چیرتی اور موجوں پر قدم رکھتی چلی جاتی ہے۔ جبکہ میں لکڑی کا وہ تختہ ہوں جو اوقیانوس کے تھپیڑے کھا رہا ہے۔ تیرے شور انگیز سخن کے اندر سے موج کے بعد موج امڈتی چلی آتی ہے۔ اور کبھی آگ کا دریا ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے، یہی موجِ آتشیں مجھے اپنے کام و دہن میں دبوچ کر نیچے لے جاتی ہے۔

اس کے باوجود میں اب بھی خود میں تھوڑی سی جرأت پاتا ہوں اور خود کو تیرے مریدوں میں سے ایک مرید تصور کرتا ہوں۔ اس لیے کہ میں نے بھی تیری طرح ایک غرقِ نور سرزمین میں زندگی بسر کی ہے اور عشق کیا ہے۔

''زلیخا نامہ'' دیوان کا ایک اور حصہ ہے جس کی تخلیق میں ایک اور ہستی بھی شامل رہی۔ لیکن یہ ایک راز تھا جس

کا انکشاف بہت بعد میں ہوا۔ یہ ہستی اس کے ایک دوست اور دور کے سفر کے دوران اس کے میزبان کی بیوی میری آنا تھی جس کے حسن و شباب، تہذیب و شائستگی اور حافظ پسندی نے ان دونوں کے درمیان محبت کا رشتہ قائم کیا۔ میری آنا اور گوئٹے کے درمیان کچھ عرصے تک تو دیوان حافظ کے اشعار کے ذریعے جذبات کا اظہار ہوتا رہا، بعد میں براہِ راست اشعار اور سوال و جواب کا تبادلہ ہونے لگا۔ میری آنا شاعرہ بھی تھی۔ چنانچہ نقادوں کا خیال ہے کہ ''زلیخا نامہ'' کے بہت سے اجزا میری آنا کے تخیل اور تخلیقی صلاحیتوں کا نتیجہ ہیں۔ ''زلیخا نامہ'' میں گوئٹے نے جہاں میری آنا کو زلیخا کا نام دیا وہاں اپنے لیے حاتم کا نام اختیار کیا۔ دیوان کے اس حصے میں گوئٹے کی مشابہت اس کے ابتدائی ناول کے ہیرو نوجوان ورتھر سے پیدا ہو جاتی ہے جو ایک ایسی لڑکی سے محبت کرتا ہے جو پہلے کسی کی منگیتر تھی اور بعد ازاں اس کی بیوی بن گئی لیکن وہ اس کی محبت کو اپنے دل سے نہ نکال سکا۔ اسی کشمکش میں بالآخر اس نے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب گوئٹے کو محسوس ہوا کہ اب اس کے لیے اپنے جذبات کو قابو میں رکھنا ممکن نہیں ہوگا تو اس نے زلیخا (میری آنا) سے ہمیشہ کے لیے دوری اختیار کر لی۔

غرض دیوان کی فضا متنوع قسم کے خیالات و تصورات سے مملو ہے جن میں مشرقیت کا رنگ بہرحال پایا جاتا ہے۔ سوائے زلیخا نامہ کے جو زیادہ تر مغربی طرزِ حیات کی نمائندگی کرتا ہے۔ دیوان کی ادبیت پر سب کا اتفاق ہے۔ دیوان کے مطالعے سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہوتی ہے کہ مشرقی (ایرانی) ادبیات میں سعدی، حافظ، نظامی، اور جامی کے مطالعے سے گوئٹے کے سامنے زندگی اور کائنات کے کچھ نئے تناظرات اجاگر ہوئے۔ یہ ایک یکسر نئی دنیا تھی۔ ایک نیا زمینی منظر نامہ جو اپنے ساتھ ایک نیا طرزِ احساس بھی لایا۔ اشیا اور الفاظ اور معانی کے درمیان نئے رشتوں کا ادراک اس کے لیے ایک نیا ذخیرۂ الفاظ، ایک نیا شعری محاورہ (Poetic idiom) کی دستیابی کا باعث بھی ہوا۔ گوئٹے کی عظمتِ فن ان تمام نوآموختہ فنی ذرائع کو بہ کمالِ فن برتنے میں ظاہر ہوئی۔ ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ گوئٹے ''دیوان'' سے فنی اعتبار سے کبھی مطمئن نہ ہو سکا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر میرے سر پر بڑھاپے کی برف نہ جم چکی ہوتی تو میں دیوان کو مزید فنی آراستگی عطا کرتا۔ شاید اسے یہ احساس ہوتا ہو کہ دیوان کی شاعری میں تکمیلیت کی وہ شان نہیں جو حافظ اور سعدی اور نظامی اور جامی کی شاعری میں پائی جاتی ہے۔ لیکن اصل بات غالباً یہ تھی کہ یہ سب کچھ، یہ اسلوب، یہ خیالات، یہ احساسات، یہ منظر نامے اور کردار۔ سب کچھ مستعار چیزیں تھیں جن میں ذاتی اپج کی کمی بہرحال رہ جاتی تھی۔ مستعاریت (Vicariousness) کا یہ احساس یقیناً اس کے دل میں خلش پیدا کرتا ہوگا۔ اس خلش کو مٹانے کے لیے اس نے دیوان پر مفصل حواشی کا اضافہ کیا اور مشرق کی دنیا کے بارے میں اپنے قارئین کو بہت سی قیمتی معلومات فراہم کرنے میں سالہا سال مصروف رہا۔ لیکن یہ بھی سب جانتے ہیں کہ شاعری صرف معلومات کی فراہمی کا نام نہیں۔ مستعاریت کے احساس کو علامہ اقبال نے ان الفاظ میں بیان کیا۔

[باوجود ان تمام باتوں کے] گوئٹے کسی خاص شاعر کا مقلد نہیں اور اس کی شاعرانہ فطرت قطعاً آزاد ہے۔ مشرق کے لالہ زاروں میں اس کی نوا پیرائی محض عارضی ہے۔ وہ اپنی مغربیت کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ اور اس کی نگاہ صرف انہی مشرقی حقائق پر پڑتی ہے جن کو اس کی مغربی فطرت جذب کر سکتی ہے۔[۱۳]

دیوان میں اگر کوئی بڑا اخلاقی پیغام ہے تو یہ کہ زندگی تہذیب اور شائستگی کی اعلیٰ سے اعلیٰ سطح پر بسر کرنی چاہیے۔ اس کے برعکس پیام مشرق کی تخلیق میں علامہ اقبال کا فنی مطمح نظر بہت بلند نظر آتا ہے۔ پیام مشرق کے دیباچے کے آخری حصے میں اس مطمح نظر کی ایک جھلک دیکھی جا سکتی ہے، وہ لکھتے ہیں:

پیام مشرق سے متعلق جو مغربی دیوان سے سو سال بعد لکھا گیا ہے، مجھے کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ ناظرین خود اندازہ کر لیں گے کہ اس کا مدعا زیادہ تر ان اخلاقی، مذہبی اور ملّی حقائق کو پیش نظر لانا ہے جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔۔۔ مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے۔ مگر اقوام مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو۔ اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن نے ان اللہ لایغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے۔ زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے۔ اور میں نے اپنے فارسی تصانیف میں اسی صداقت کو مدنظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالک مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافی حدود سے بالاتر کر کے ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو، قابلِ احترام ہے۔[۱۴]

اس کے بعد اقبال نے شاہ افغانستان امیر امان اللہ کا ذکر کیا ہے جن کو افغانوں کی تربیت سے خاص دلچسپی ہے، اور کتاب کو انہی کے نام سے منسوب کیا ہے، متن کتاب کے آغاز میں طویل انتسابی اشعار اقبال کے اندرونی جذبات کے ترجمان ہیں۔ اقبال اس سلسلے میں بھی گوئٹے سے مشابہت چاہتے تھے کہ ان کو بھی کوئی مقامی پرنس اپنی سرپرستی میں لے لے اور وہ یکسوئی کے ساتھ اپنا تخلیقی اور تحقیقی کام جاری رکھ سکیں۔ لیکن افسوس کہ امیر امان اللہ خاں کو بہت جلد تخت سے دستبردار ہونا پڑا۔ بعد ازاں یہی جذبات انہوں نے نادر شاہ سے وابستہ کیے جس کی دعوت پر وہ سید سلیمان ندوی اور سر راس مسعود افغانستان کی تعلیمی اصلاحات کے لیے افغانستان گئے تھے لیکن نادر بھی جلد ہی قتل کر دیئے گئے۔ یوں ان کی یہ خواہش صحیح معنوں میں کبھی پوری نہ ہو سکی۔ زندگی کے آخری سالوں میں سر راس مسعود کے توسط سے ان کا تعلق ریاست بھوپال سے پیدا ہوا لیکن صحت کے مسائل نے انہیں مطلوبہ یکسوئی اور اطمینان خاطر کبھی حاصل نہ ہونے دیا۔

پیام مشرق کی شاعری ان کی فارسی شاعری میں ایک خاص مقام کی حامل ہے۔ اس کا پہلا حصہ ''لالۂ طور'' کے خوبصورت عنوان سے ایک سو چونسٹھ قطعات پر مشتمل ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان قطعات میں اقبال

نے اپنا سینہ کھول کر رکھ دیا ہے۔ ان قطعات میں تفکر سے زیادہ جذبے اور تخیل کی کارفرمائی محسوس ہوتی ہے۔

دوسرا حصہ ''مئے باقی'' کے عنوان سے غزلیات پر مشتمل ہے، یوں تو بعد ازاں زبورِ عجم بھی بیشتر غزلیات ہی پر مشتمل تھی لیکن پیامِ مشرق کی غزلیات ہر دور کی فارسی غزل کے لیے سرمایۂ افتخار ہیں، ان میں جذبے اور تخیل کے ساتھ تفکر کی آمیزش اس قدر دلنشین ہے کہ باید و شاید۔ تغزل میں فلسفیانہ تصورات (Concepts) کو اس طرح سمونا کہ شعریت کو ذرا بھی گزند نہ پہنچے اقبال ہی کا حصہ ہے۔ اقبال کے نزدیک ''انسان'' کوئی تکمیل یافتہ ہستی نہیں بلکہ وجودِ ممکن ہونے کی وجہ سے ہر لحظہ اس کی تشکیل نو ممکن ہے۔ ایک غزل میں کہتے ہیں:

بہ نوریاں ز من پا بہ گِل پیامے گوے
حذر ز مشتِ غبارے کہ خویشتن نگر است[۱۵]

....

ز خاک خویش بہ تعمیر آدمے برخیز
کہ فرصت تو بقدر تبسم شرر است[۱۶]

ایک اور شعر میں کہتے ہیں:

گماں مبر کہ سرشتند در ازل گل ما
کہ ما ہنوز خیالیم در ضمیر وجود[۱۷]

اپنی ہستی کے اثبات میں ڈیکارٹ کا یہ جملہ بہت مشہور ہے: ''میں سوچتا ہوں اس لیے میں ہوں۔'' (Cogito ergo sum) اب سے کچھ عشرے پیشتر یہ جملہ ہر ترقی پسند کی زبان پر رہتا تھا اور اسے دنیا کی ہر حقیقت کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ اس حقیقت سے بے خبر کہ یہ ایک موضوعی (Subjective) بیان ہے جس کو خارجی طور پر ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے برعکس اقبال ایک غزل میں کہتے ہیں:

در بود و نبود من اندیشہ گماں ہا داشت
از عشق ہویدا شد ایں راز کہ ہستم من[۱۸]

میرے ہونے نہ ہونے کے بارے میں عقل کو سو طرح کے اندیشے لاحق تھے لیکن عشق سے یہ راز بھی آشکار ہوا کہ میں ہوں۔

کہا جا سکتا ہے کہ یہ بھی ایک داخلی بیان ہے لیکن اقبال نے عشق کی جو تعریف متعین کی ہے اس کی روشنی میں دیکھا جا سکتا ہے کہ عشق (بظاہر) اپنی لامتناہی سرگرمیوں کے باعث خارج میں اپنا اثبات ناقابلِ تردید حد تک کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس صورت میں اقبال کا Dictum یہ ہوگا: I love therefor I am. اس میں بھی شک نہیں کہ ''مئے باقی'' کی غزلوں پر کہیں کہیں حافظ شیرازی کے رنگ کی چھوٹ بھی پڑتی دکھائی دیتی ہے، مثلاً

ایک شعر ملاحظہ ہو:

درِ میخانہ زدم، مغبچگانم گفتند
آتشے در حرم افروز و تپیدن آموز[۱۹]

اس کی لفظیات پر حافظ کے ان اشعار کا اثر دیکھا جا سکتا ہے:

دوش رفتم بدرِ میکدہ خواب آلودہ
خرقہ تر دامن و سجّادہ شراب آلودہ
آمد افسوس کناں مغبچۂ بادہ فروش
گفت بیدار شو اے رہرو خواب آلودہ
شست و شوی کن وا نگاہ بہ خرابات خرام
تا نگردد ز تو ایں دیرِ خراب، آلودہ[۲۰]

اور اب آخر میں وہ غزل جس کا آخر میں دیا گیا شعر اربابِ جذب و شوق آنکھوں کو پرنم کیے بغیر نہیں پڑھ سکتے:

نہ تو اندر حرم گنجی، نہ در بت خانہ می آئی
ولیکن سوئے مشتاقاں چہ مشتاقانہ می آئی
قدم بیباک تر نہ در حریم جان مشتاقاں
تو صاحب خانۂ آخر چرا دزدانہ می آئی
بہ غارت می بری سرمایۂ تسبیح خواناں را
بہ شب خون دلِ زناریاں ترکانہ می آئی
گہے صد لشکر انگیزی کہ خون دوستاں ریزی
گہے در انجمن با شیشہ و پیمانہ می آئی
تو بر نخل کلیمے بے محابا شعلہ می ریزی
تو بر شمع یتیمے صورتِ پروانہ می آئی[۲۱]

آخر میں ایک ایسا شعر جس میں بیان کیا ہوا خیال ان کے ہاں کئی صورتیں بدل کر آتا ہے:

بہ دیریاں سخن نرم گو کہ عشق غیور
بنائے بت کدہ افگند در دل محمود[۲۲]

❁……❁……❁

حوالہ جات وحواشی

۱- ڈاکٹر گیان چند، ابتدائی کلام اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۱۲۰۔
۲- ایڈورڈ ڈاؤڈن، ایسٹ ویسٹرن دیوان، (انگریزی ترجمہ) لندن، ۱۹۱۳ء، ص ix۔
۳- ڈاکٹر جاوید اقبال، زندہ رود، لاہور ۲۰۰۴ء، ص ۳۳۸
۴- عبدالمجید سالک، ذکرِ اقبال، ص ۱۱۷
۵- علامہ محمد اقبال، پیام مشرق (کلیات اقبال)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۱۷۷
۶- ایڈورڈ ڈاؤڈن، محولہ بالا، ص x-iv
۷- علامہ محمد اقبال، پیام مشرق، ص ۱۵۵
۸- ایضاً، ص ۸۔
۹- شجاع الدین ضیاء (مترجم) دیوان شرقی گوتہ ۱۹۴۹ء، ص ۲۱۔
۱۰- ایضاً، ص ۲۱۔
۱۱- ایضاً، ص ۲۱۔
۱۲- علامہ اقبال، دیباچہ پیام مشرق، ص ۷، ۸۔
۱۳- ایضاً۔
۱۴- ایضاً۔
۱۵- علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۳۱۶۔
۱۶- ایضاً، ص ۳۱۷۔
۱۷- ایضاً، ص ۳۱۳۔
۱۸- ایضاً، ص ۳۲۲۔
۱۹- ایضاً، ص ۳۲۸۔
۲۰- حافظ شمس الدین محمد شیرازی، دیوان حافظ، بہ تصحیح وتوضیح: پرویز ناتل خانلری، چاپ دوم باتجدید، قطر، ۱۳۵۲ح، ش، تہران، ص ۸۴۴۔
۲۱- علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۳۴۳۔
۲۲- ایضاً، ص ۳۱۴۔